قرآن میں دلیل کا انداز!

ڈاکٹر اختر حسین عزمی

دوسری صدی ہجری میں جب یونانی فلسفہ مسلمانوں کے درمیان بحث کا عنوان بنا تو ان علوم وافکار کے زیر اثر، اُس زمانے کے 'دانش وروں' نے اسلامی عقائد کے بارے میں بے شمار اشکالات اور فکری مغالطوں کی تردید کے لیے فلسفیانہ سوالات کی عقلی بنیادوں پر تردید کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ مسلمانوں میں ایک نیا علم، علم کلام وجود میں آیا، جس میں فلسفے کی طرح کسی بات کے اثبات وتردید کے لیے دلیل دینے کے طریقے رائج ہوئے۔ بلاشبہہ اس ذریعے سے اس دور کے اہلِ علم نے یونانی فلسفے کی زہرناکی کا مؤثر علاج کیا۔ اس طرح نہ صرف عقلِ سلیم کو متاثر کیا بلکہ تہذیب نفس کا کام بھی کیا۔

علم کلام اور قرآنی استدلال کا فرق

امام غزالی [م: ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء] نے اپنے زورِ استدلال سے یونانی فلسفہ سے مرعوب ذہنوں کے سامنے یونانی فلسفے کی کمزوری کو عیاں کیا۔ وہ قرآنی دلائل اور فلسفیانہ طرزِفکر رکھنے والے متکلمین کے دلائل کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''قرآنی دلائل غذا کی مانند ہیں، جس سے ہر انسان استفادہ کرتا ہے، جب کہ متکلمین کے دلائل دوا کی طرح ہیں جس سے کچھ لوگوں کو تو فائدہ ہوتا ہے لیکن ایک بڑی تعداد کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ قرآنی دلائل پانی کی مثل ہیں، جس سے دودھ پیتا بچہ اور تنومند شخص، دونوں ہی فائدہ اٹھاتے ہیں، جب کہ دوسرے دلائل [مرغن] کھانوں کی طرح ہیں، جن سے صحت مند اور طاقت ور لوگوں کو تو کبھی فائدہ ہوتا ہے اور کبھی نقصان، لیکن دودھ پیتے بچے اس سے بالکل فائدہ نہیں اٹھا سکتے'' (علم الکلام، ص ۲۰)۔

مراد یہ کہ جن ذہنوں کو یونانی فلسفے نے پریشاں فکری میں مبتلا کر دیا ہو، ممکن ہے کہ منطقی دلائل سے ان کی تشفی ہو جائے، لیکن اس چیز کا امکان موجود ہے کہ اکثر لوگوں کو یہ اسلوب الٹا شکوک وشبہات میں مبتلا کر دے، جب کہ قرآنی دلائل اپنی سادگی کے باعث غذا اور پانی کی طرح ہر ذہنی سطح کے فرد کی پیاس اور بھوک مٹا سکتے ہیں۔

امام فخرالدین رازی [م:۶۰۶ھ/ ۱۲۱۰ء] متکلمین وفلاسفہ کے امام ہیں اور مفسر قرآن بھی۔ وہ تفسیر کبیر میں قرآنی طرزِ استدلال کی افادیت یوں بیان کرتے ہیں: ''قرآن کا دلیل دینے کا انداز عوام الناس کے ذہنوں کے زیادہ قریب ہے اور ان کی عقلوں میں بات بٹھانے کا مؤثر ذریعہ ہے۔ قرآنی دلائل کو انسانی ذہنوں کے قریب تر ہی ہونا چاہیے تاکہ خواص وعوام اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ پھر یہ ہے کہ قرآنی دلائل کا مقصد بحث ومناظرہ نہیں بلکہ صحیح عقائد کو دل نشین کرانا ہے اور اس مقصد کے لیے اس قسم کے دلائل دوسری قسم کے دلائل سے زیادہ مضبوط اور مؤثر ہوتے ہیں'' (تفسیر کبیر، ج۲،ص۹۸)۔

زندگی کے آخری دنوں میں امام رازی نے جو وصیت اپنے شاگرد ابراہیم اصبہانی کو تحریر کرائی، اس میں بھی کلام وفلسفہ اور قرآن کے بارے میں انھوں نے کہا: ''میں نے فلسفہ وکلام کے طریقوں کو آزما لیا، لیکن مجھے ان میں کوئی ایسا فائدہ نظر نہ آیا جو اُس فائدے کے برابر ہو، جو میں نے قرآن میں پایا ہے۔ اس لیے کہ قرآن، اللہ کی عظمت کو منواتا ہے اور خواہ مخواہ کی باریک بینی اور موشگافی سے بچاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ جانتا ہے، انسانی عقلیں ان طویل اور تنگ گھاٹیوں اور خفیہ راستوں میں بھٹک کر رہ جاتی ہیں'' (طبقات الشافعیہ، ج۸،ص۹۱)۔

ابن کثیر [م:۷۷۴ھ/ ۱۳۷۳ء] کے مطابق امام رازی نے لکھا ہے: ''میں کلام اور فلسفے کے طریقوں کو آزما چکا ہوں۔ یہ نہ تو کسی پیاسے کی پیاس بجھا سکتے ہیں اور نہ کسی بیمار کو شفا دے سکتے ہیں۔ اس کام کے لیے تمام راستوں کے مقابلے میں قریب ترین راستہ قرآن کا راستہ ہے'' (البدایہ والنہایہ، ج۱۳،ص۵۶)۔

امام ابن تیمیہ (م:۷۲۸ھ/ ۱۳۲۸ء) کے مطابق متکلمین وفلاسفہ کے طرزِ استدلال میں غیر ضروری طوالت اور تکلفات سے کام لیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''اہل کلام وفلسفہ نے

مطالب الٰہیہ پر جو عقلی دلائل قائم کیے ہیں، ان کے مقابلے میں قرآن مجید کے دلائل کہیں زیادہ مکمل، بلیغ اور مؤثر ہیں۔ پھر اس کے ساتھ وہ ان بڑے مغالطوں سے بھی پاک وصاف ہیں، جو فلسفیوں اور متکلمین کے دلائل میں پائے جاتے ہیں'' (الرّد علی المنطقیین، ص۳۲۱، ۲۵۵)۔

قرآنی استدلال کا آغاز خشک اور پیچیدہ متکلمانہ مقدمات سے نہیں ہوتا بلکہ ہر مخاطب کی ذہنی سطح کے اعتبار سے قرآن حجت پیش کرتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے پاس جب ان کے ہم نشین دو قیدی اپنے خواب کی تعبیر پوچھنے آئے، تو انھوں نے تعبیر بتانے کے وعدے کے ساتھ ان کے سامنے ایک سوال رکھا:

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾ (یوسف ۱۲:۳۹) کیا بہت سے متفرق ربّ بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟

آقا وغلام کی معاشرتی حیثیت سے واقف ہر شخص کے لیے سوال کا یہ انداز جتنا عام فہم ہے، لامحالہ اس کا جواب ایک ہی ہے، خواہ اس سوال کا مخاطب اَن پڑھ ہو یا اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ یہ تو ممکن ہے کہ اس سوال کے جواب میں اَن پڑھ اتنا ذہنی وروحانی لطف نہ اٹھائے جتنا کہ ایک تعلیم یافتہ اس سے لذت پائے گا لیکن کوئی تعلیم یافتہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سوال عامیانہ ہے، میرے علمی مرتبے کے مطابق نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن جب یہ کہتا ہے کہ:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (انبیاء ۲۱:۲۲) اگر آسمان اور زمین میں ایک اللہ کے علاوہ دوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین وآسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔

لہٰذا، اس آیت میں بتائی گئی حقیقت سے کسی سطح کا آدمی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ کوئی خاندان ہو یا ملک، اگر اس کے سربراہ ایک سے زائد ہوں گے تو نتیجہ کیا ہوگا۔

محسوس واقعات کے ذریعے غیر محسوس حقائق پر استدلال

قرآن محسوس واقعات کے ذریعے غیرمحسوس حقائق پر استدلال کرتا ہے۔

اَبرہہ کے ہاتھیوں کے ساتھ آنے والے ۶۰ ہزار کے لشکر کے مقابلے کا تصور عرب کے منتشر قبائلی معاشرے میں ممکن ہی نہ تھا۔ اس موقعے پر خود مجاورینِ کعبہ (قریش) نے ۳۶۰ بتوں کی موجودگی کے باوجود صرف ایک ربّ سے اپنے گھر کی حفاظت کی فریاد کی تھی، کسی دیوتا کو نہیں

پکارا تھا۔ تمام جاہلی شاعری بھی اس واقعے پر گواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس محسوس واقعہ کو یاد دلاتے ہوئے کس طرح غیرمحسوس حقیقت کی طرف متوجہ کیا:

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِؕ ﴿۱﴾ (الفیل۱۰۵:۱) تم نے دیکھا نہیں کہ تیرے ربّ نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟

اصحاب الفیل کے ساتھ جو کچھ کیا وہ 'تیرے ربّ' یعنی محمدؐ کے ربّ نے کیا۔ اس لیے کہ اس اکیلے ربّ کی طرف تو محمدؐ ہی دعوت دے رہے تھے، جب کہ مشرکین قریش کو تو ایک ربّ کی بات سننا بھی گوارا نہ تھی۔ حالانکہ اس حقیقت کا مشاہدہ ہی نہیں بلکہ اپنی زبانوں سے اس کا اقرار خانہ کعبہ کے پردوں کو پکڑ کر تمام سرداران قریش چالیس پینتالیس سال پہلے کر چکے تھے۔

اسی طرح سورۂ قریش جو درحقیقت سورۂ فیل ہی کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے، محسوس واقعے کو غیرمحسوس حقیقت کے ماننے پر متوجہ کرتی ہے۔ دورجاہلیت میں عرب میں ہر طرف قافلے لٹتے تھے، لیکن مجاورینِ کعبہ ہونے کے باعث قریش کے تجارتی قافلوں کو عقیدت و احترام سے گزرنے دیا جاتا تھا۔ امن و امان کی اس گارنٹی کے باعث قریش کو عرب میں تجارتی اجارہ داری حاصل تھی اور حرم کے نذرانوں کی آمدن الگ تھی۔ عرب کی معاشی بدحالی اور بھوک کے زمانے میں قریش کو وافر سامانِ طعام ملا اور بدامنی کے خوف کے دنوں میں امن و امان ملا۔ اس کا وہ کیسے انکار کر سکتے تھے کہ یہ سب کچھ انھیں خانہ کعبہ کے متولی ہونے کی حیثیت سے ملا ہے۔ قرآن نے بھوک اور خوف کی جگہ کھانے اور امن کے محسوس واقعے کا حوالہ دے کر ربّ کی عبادت کی طرف متوجہ کیا:

فَلۡيَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَيۡتِۙ ﴿۳﴾ الَّذِىۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ﴿۴﴾ (القریش ۱۰۶: ۳-۴) پس انھیں چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انھیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا۔

مخاطب کے اقرار پر مبنی دلائل

قرآنی دلائل مخاطب کے اقرار پر مبنی ہوتے ہیں یا ایسے قوانین فطرت کے بیان پر مبنی ہوتے ہیں، جو کائنات میں اٹل اور مستقل اصول کی حیثیت سے جاری ہیں۔ چونکہ قرآن کے مخاطب وجود باری کے منکر نہ تھے، اس لیے وجود باری پر براہ راست دلائل دینے کے بجائے بالواسطہ طور پر

صفات باری کے بیان کے ذریعے ایسے خالق کا وجود منوایا گیا، جو قادر مطلق اور خلّاق عظیم ہے، جو قہّار وجبّار ہونے کے ساتھ ستّار وغفّار ہے، جو بصیر وعلیم ہونے کے ساتھ رحیم وکریم ہے۔ اسی کو بنیاد بناتے ہوئے ان کے شرک کے بودے پن کو نمایاں کیا گیا:

ان سے پوچھو، کون تمھیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جان دار کو اور جان دار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ اور کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ کہو پھر اللہ سے ڈرتے کیوں نہیں ہو؟ (یونس ۱۰:۳۱)

مخاطب عوام ہوں یا ان کے اہل فکر، خدا کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے تھے، البتہ شرک کرتے تھے۔ وجود باری پر دلیل اس لیے نہیں دی گئی کہ دلائل کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں دلیل دعوے سے زیادہ واضح ہو۔ یہاں تو دعویٰ بذات خود واضح تھا۔

آفاق وانفس میں غور وفکر کی دعوت

علوم قرآن کے ماہرین نے قرآنی دلائل کو دو بڑی اقسام میں تقسیم کیا ہے:
(۱) دلائل عقلی (۲) دلائل نقلی۔

دلائل عقلی کی بنیاد یہ آیت ہے: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ط (حم السجدہ ۴۱:۵۳) ''عنقریب ہم انھیں اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے''۔

امام قرطبیؒ نے آفاق وانفس کا یہ مفہوم نقل کیا ہے: ''آفاق سے مراد ہیں آسمانوں اور زمین کے اطراف میں موجود قدرت کی نشانیاں، مثلاً سورج، چاند، ستارے، رات اور دن، ہوائیں اور بارشیں، گرج چمک، کڑک، سبزہ، درخت، پہاڑ اور دریا وغیرہ، اور انفس میں انسانوں کے نفسوں میں لطیف صنعت اور عجیب وغریب حکمت کی جانب اشارہ ہے'' (تفسیر قرطبی، ج۱۵، ص ۲۴۴)۔

مولانا مودودیؒ [م: ۱۹۷۹ء] آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ آفاق ارض وسماء میں بھی اور انسانوں کے اپنے وجود میں بھی لوگوں کو وہ نشانیاں دکھائے گا، جن سے ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن جو تعلیم دے رہا ہے، وہی برحق ہے'' (تفہیم القرآن، ج۴، ص ۴۷۰)۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ [م: ۱۹۹۷ء] کے مطابق: ''آفاقی دلائل سے مراد کائنات میں موجود شواہد ہیں۔ مثلاً رات دن کا تسلسل، سورج اور چاند کی گردش، ہواؤں کے تصرفات، پہاڑوں اور سمندروں کے عجائبات، وسائل رزق کا انتظام وغیرہ۔ دلائل انفس سے مراد انسانی نفسیات اور اس کے اندر ودیعت کردہ حقائق و مسلمات ہیں''۔ (اصول فہم قرآن، ص ۹)

اسی بات کو ایک جگہ یوں فرمایا: وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ﴿٢٠﴾ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿٢١﴾ (الذاریات ۵۱:۲۰-۲۱) ''زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین والوں کے لیے اور خود تمھارے اپنے وجود میں ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟''۔

● **انفسی دلائل** (انسانی وجود پر مبنی دلائل): انسانوں کے اپنے اندر یہ ودیعت کردہ حقائق کیا ہیں؟ ان کی ایک مثال ملاحظہ کریں، فرمایا: وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ○ (القیامۃ ۷۵:۲) ''اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی''۔

'نفس لوّامہ' کیا ہے؟ سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے مطابق یہ وہ نفس ہے، جو غلط کام کرنے یا غلط سوچنے یا بری نیت رکھنے پر نادم ہوتا ہے اور انسان کو اس پر ملامت کرتا ہے اور اسی کو ہم آج کل کی اصطلاح میں 'ضمیر' [Conscience] کہتے ہیں: اس ضمیر میں لازماً برائی اور اچھائی کا ایک احساس پایا جاتا ہے، اور چاہے انسان کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اس کا ضمیر اسے کوئی برائی کرنے اور کوئی بھلائی نہ کرنے پر ضرور ٹوکتا ہے۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی وجود ہے۔ اس کے اندر فطری طور پر بھلائی اور بُرائی کی تمیز پائی جاتی ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو اپنے اچھے اور بُرے افعال کا ذمہ دار سمجھتا ہے اور جس برائی کا ارتکاب اس نے دوسروں کے ساتھ کیا ہو، اس پر اگر وہ اپنے ضمیر کی ملامتوں کو دبا کر خوش بھی ہو لے، تو اس کے برعکس صورت میں، جب کہ اُسی برائی کا ارتکاب کسی دوسرے نے اس کے ساتھ کیا ہو، اس کا دل اندر سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس زیادتی کا مرتکب ضرور سزا کا مستحق ہونا چاہیے۔ اب اگر انسان کے وجود میں اس طرح کے ایک نفس لوامہ کی موجودگی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، تو پھر یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ یہی نفس لوّامہ زندگی بعدِ موت کی ایک ایسی شہادت ہے جو خود انسان کی فطرت میں موجود ہے، کیونکہ فطرت کا یہ تقاضا کہ اپنے جن اچھے اور بُرے اعمال کا انسان ذمہ دار ہے، ان کی جزا یا سزا

اس کو ضرور ملنی چاہیے، زندگی بعد موت کے سوا کسی صورت میں پورا نہیں ہوسکتا'' (تفہیم القرآن ج ۶، ص ۱۶۳)۔

اسی سورت میں آگے یہ فرمایا:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ ﴿۱۵﴾ (القیامۃ ۷۵:۱۴-۱۵)

بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے، چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے۔

اس آیت کی تفسیر میں مولانا مودودی لکھتے ہیں: ''ہر انسان خوب جانتا ہے کہ وہ خود کیا ہے؟ اپنے آپ کو جاننے کے لیے وہ اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ کوئی دوسرا اسے بتائے کہ وہ کیا ہے؟ ایک جھوٹا دنیا بھر کو دھوکا دے سکتا ہے، لیکن اسے خود تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک گمراہ آدمی ہزار دلیلیں پیش کر کے لوگوں کو یہ یقین دلا سکتا ہے کہ وہ جس کفر یا دہریت یا شرک کا قائل ہے، وہ درحقیقت اس کی ایمان دارانہ رائے ہے، لیکن اس کا اپنا ضمیر تو اس سے بے خبر نہیں ہوتا کہ ان عقائد پر وہ کیوں جما ہوا ہے؟'' (تفہیم القرآن، ج ۶، ص ۱۶۷)۔

کہیں انسان کے غرور نفس اور اللہ کے سامنے اس کی بے بسی کو یوں بیان کیا:

یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ﴿۶﴾ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ﴿۷﴾ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ﴿۸﴾ (الانفطار ۸۲:۶-۸) اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے اُس ربِّ کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نِک سُک سے درست کیا، تجھے متناسب بنایا، اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا؟

● **آفاقی دلائل**: انسان کو اپنی تخلیق اور اس کی ذات کے مختلف پہلوؤں کی طرف دعوت غور و فکر دینے کے ساتھ ساتھ قرآن نے بے شمار مقامات پر انسان کے اردگرد پھیلی کائنات (آفاق) پر بھی اسے غور کرنے کی دعوت دی ہے:

بے شک آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے اختلاف میں، اُن کشتیوں میں جو لوگوں کی نفع رسانی کی چیزیں اٹھائے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اُوپر سے برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے مُردہ زمین کو زندہ کیا اور اس میں ہر قسم کے چوپائے پھیلائے، ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں

جو زمین وآسمان کے درمیان پابند ہیں، عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں (البقرہ ۲:۱۶۴)۔

اس آیت میں گیارہ چیزوں کو توحید کے حق میں دلائل کے طور پر پیش کیا گیا۔ سورۂ انعام کی آیات ۹۰ تا ۹۹ میں اللہ نے سترہ چیزوں کو اپنی توحید کے اثبات میں دلائل کے طور پر پیش کیا ہے۔ سورۂ نحل کی آیات ۳ تا ۱۳ میں زمین وآسمان، جانوروں اور پرندوں کی تیرہ نشانیوں کو علم وحکمت رکھنے والی ذات واحد کے وجود کی کھلی دلیل قرار دیا۔ اس موضوع پر سیکڑوں آیات ہیں جو انتہائی عام فہم اور دل نشین انداز میں اللہ کی یکتائی کے اوپر قطعی دلیل ہیں اور ان سے جہاں ایک تعلیم یافتہ آدمی اپنی ذہنی وفکری رہنمائی کا سامان پاتا ہے وہاں ایک اَن پڑھ دیہاتی بھی ان پر جھوم اٹھتا ہے۔

● **نقلی دلائل** (تاریخی واقعات پر مبنی دلائل): قرآن نے عقائد اسلام کے اثبات پر عقلی دلائل کے ساتھ نقلی دلائل بھی پیش کیے ہیں۔

● **انبیاء کی دعوت**: اس کے لیے مشاہیر انبیاء کے اپنی اپنی قوم سے جو مکالمے ہوئے، ان کو بیان کیا ہے۔ تمام انبیاء کی دعوت میں ایک بنیادی بات جو مشترک ہے، وہ اللہ کی عبادت اور شرک سے اجتناب ہے:

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۱۶:۳۶) اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ ''اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو''۔

سورۂ اعراف میں حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، اور حضرت شعیبؑ اپنی اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے ایک ہی جملے کا بار بار تذکرہ کرتے نظر آتے ہیں:

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ (اعراف ۷:۵۹، ۶۵، ۷۳، ۸۵) اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔

مختلف مقامات پر قرآن نے حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ کی دعوت بھی یہی بیان کی ہے:

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ (عنکبوت ۲۹:۱۶) اور ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اور اسی سے ڈرو۔

اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو پہلی وحی میں یہ تاکید کی:

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ (طٰہٰ ۲۰:۱۴) بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں، پس تو میری بندگی کر۔

وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ (المائدہ ۵:۷۲) مسیحؑ نے کہا: اے بنی اسرائیل اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی۔

● **اہلِ حق کی سیرت سے استدلال:** قرآن کریم نے آزمایش میں توحید پر ثابت قدم رہنے والے اپنے اولیاء کے واقعات سے بھی استدلال کیا ہے۔ اس لیے کہ ان کا کردار بھی توحید کی حقانیت اور صداقت کی تاریخی دلیل ہے، مثلاً 'اصحاب الکہف' (غار والوں) کا ذکر۔ جب ان پر اپنی مشرک قوم کی اذیتیں ناقابل برداشت ہوگئیں تو وہ ہجرت کر کے ایک غار میں جا چھپے اور اللہ نے انھیں کم وبیش تین سو سال سلائے رکھا۔ یہ واقعہ اللہ کی توحید وقدرت اور موت کے بعد کی زندگی کے وقوع پر نقلی دلیل کے طور پر بیان ہوا ہے:

ہم ان (اصحاب کہف) کا اصل قصہ تمھیں سناتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے ربّ پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔ ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیئے جب وہ اٹھے اور انھوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ''ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے''۔ (پھر انھوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا) ''یہ ہماری قوم تو رب کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے۔ یہ لوگ ان کے معبود ہونے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟'' (الکہف ۱۸:۱۳-۱۴)

تفہیم القرآن کے مطابق یہ نوجوان ۲۵۰ء سے ۴۴۶ء تک، یعنی تقریباً دو سو سال تک سوئے رہے۔ ترکی کے شہر ازمیر (سمرنا) کے قریب شہر افسس کے کھنڈرات موجود ہیں، جہاں

مشرک بادشاہ دقیانوس یا دَقیُوس کے ظلم کے باعث وہ غار میں پناہ گزیں ہوئے اور عیسائی بادشاہ تھیوڈوسیس ثانی کے دور میں بیدار ہوئے (تفہیم القرآن، ج ۳،ص ۱۳)۔

قرآن میں ایک واقعہ 'اصحاب الاخدود' کے مقابل ان اولیاء اللہ کا بیان ہوا ہے، جنھوں نے 'اصحاب الاخدود' کے وحشیانہ مظالم کے مقابلے میں صبر واستقامت کا مظاہرہ کیا تھا اور اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر عقیدۂ توحید کے برحق ہونے کی شہادت دی تھی:

> مارے گئے گڑھے والے۔ (اس گڑھے والے) جس میں خوب بھڑکتے ہوئے ایندھن کی آگ تھی۔ جب کہ وہ اس گڑھے کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے، اسے دیکھ رہے تھے۔ اور ان اہل ایمان سے ان کی دشمنی اس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھی کہ وہ اُس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے، جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے، اور وہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ (البروج ۸۵:۴-۹)

ابن ہشام، طبرانی اور ابن خلدون کے مطابق نجران (یمن) کے یہودی بادشاہ ذونواس نے دینِ مسیح کے بیس ہزار پیروکاروں کو اپنا دین ترک نہ کرنے کی پاداش میں آگ میں بھرے گڑھوں میں پھینک کر جلوادیا۔ (تفہیم القرآن، جلد ۶،ص ۲۹۷-۲۹۸)

یہ واقعہ اکتوبر ۵۲۳ء میں پیش آیا تھا۔ نزولِ قرآن سے تقریباً نوے سال قبل کے اس واقعہ کو قرآن نے ایک تاریخی دلیل کے طور پر نقل کیا ہے کہ اولیاء اللہ صرف اللہ کی عبادت کرتے اور غیبی امداد کے لیے اسی کو پکارتے تھے۔

● **حکما و دانش وروں کا تذکرہ:** ہر دور میں ایسے دانش مند حکما موجود رہے ہیں، جن کی حکمت ودانش کی باتیں بعد کے ادوار میں بھی زبان زدِعام رہی ہیں۔ قرآن ان کی حکمت آمیز باتوں کو بھی عقائد کی تفہیم کا ذریعہ بناتا ہے۔ ایسی شخصیات میں سے ایک حکیم لقمان ہیں، جو نہ صرف مکارمِ اخلاق کے معلم تھے بلکہ اللہ کی توحید کے علَم بردار بھی تھے۔ امام سعید بن مسیب [م:۷۱۵ء] کے مطابق لقمان نسلی اعتبار سے سوڈانی تھے، جنھیں اللہ نے حکمت ودانائی سے نوازا تھا، مگر وہ نبی نہیں تھے۔ مدین اور ایلا کے علاقے میں رہنے کے باعث ان کی زبان عربی تھی اور ان کی شخصیت عرب میں

ایک حکیم ودانا کی حیثیت سے معروف تھی۔ شعرائے جاہلیت امرؤ القیس بن حجر [م: ۵۴۴ء]، طرفہ بن العبد [م: ۵۶۹ء]، اعشیٰ [م:۶۲۹ء] اور لبید بن ربیعہ عامری [م:۶۶۱ء] کے کلام میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

اوّلین سیرت نگار ابن اسحاق [م:۱۵۰ھ/ ۷۶۸ء] کے مطابق یثرب کے خاندان عمرو بن عوف (بنواوس) کا ایک شخص سوید بن صامت حج کے لیے مکہ آیا۔ وہ اپنی قوم میں ''الکامل'' کے لقب سے مشہور تھا۔ حضورؐ سے ملاقات میں اس نے بتایا کہ اس کے پاس لقمان کی حکیمانہ باتوں کا مجلّہ ہے۔ اس نے اس میں سے جب کچھ سنایا تو آپؐ نے ان باتوں کو سراہا اور فرمایا: میرے پاس اس سے بھی بہتر کلام ہے۔ پھر قرآن پڑھ کر سنایا تو سوید نے قرآن کی تعریف کی۔ یثرب پہنچنے کے بعد اسے بنوخزرج نے قتل کر دیا۔ ان کے خاندان کے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مسلمان ہو چکا تھا۔ (سیرت ابن ہشام، ص ۳۷۳-۳۷۴)

قرآن نے حکیم لقمان کی باتیں نقل کی ہیں:

> یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا: ''بیٹا، خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے''۔ (لقمان ۳۱:۱۳)

مولانا مودودی آیت کے سیاق وسباق میں لکھتے ہیں: ''شرک کی تردید میں ایک پُرزور عقلی دلیل پیش کرنے کے بعد اب عرب کے لوگوں کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ معقول بات آج کوئی پہلی مرتبہ تمھارے سامنے پیش نہیں کی جا رہی ہے بلکہ پہلے بھی عاقل ودانا لوگ یہی بات کہتے رہے ہیں اور تمھارا اپنا مشہور حکیم، لقمان اب سے بہت پہلے یہی کچھ کہہ گیا ہے''۔ (تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۱۳)

(لقمان نے کہا تھا) کہ ''بیٹا کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو، اللہ اسے نکال لائے گا۔ وہ باریک بین اور باخبر ہے۔ بیٹا، نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر، اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔ اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین میں اکڑ کر چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر، اپنی آواز ذرا پست رکھ، سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے''۔ (لقمان ۳۱:۱۶-۱۹)

● **نازل شدہ کتابوں کی گواہی**: اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے قرآن نے تاریخی دلیل کے طور پر پہلی آسمانی کتابوں کے حوالے بھی دیئے ہیں تاکہ ان کتابوں کے ماننے والوں پر حجت تمام ہوجائے مثلاً: ''اور بے شک ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی تھی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ذریعۂ ہدایت بنایا تھا۔ اس تاکید کے ساتھ کہ میرے سوا کسی کو اپنا وکیل نہ بنانا''۔(بنی اسرائیل ۱۷:۲)

''اے نبیؐ! کہو، ''اے اہل کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے''۔(اٰل عمرٰن ۳:۶۴)

نبی آخرالزماںؐ پر ایمان کے لیے سابقہ کتب میں ان کے ذکر کو بنیاد بنایا گیا: (رحمت کے حق دار تو وہ ہیں) جو اس پیغمبر، نبی اُمّی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے''۔(اعراف ۷:۱۵۷)

''اور جب عیسیٰؑ ابن مریم نے کہا تھا کہ ''اے بنی اسرائیل، میں تمھاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے، اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا''۔(الصف ۶۱:۶)

مولانا رحمت اللہ کیرانوی [م:۱۸۹۱ء] نے اپنی کتاب اظہار الحق میں تورات وانجیل کی بے شمار عبارات اور کتب حدیث وسیرت سے علمائے اہل کتاب کے مستند وواقعات جمع کردیئے ہیں جن سے رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثلاً نجاشی [م:۶۳۲ء] حبشہ نے حضرت جعفر طیارؓ [شہادت: ۶۲۹ء] کی تقریر پر کہا: اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللهِ صَادِقًا مُصَدِّقًا، وَقَدْ بَايَعْتُكَ وَبَايَعْتُ ابْنَ عَمِّكَ اَيْ جَعْفَرَ بْنَ اَبِي طَالِبٍ، وَاَسْلَمْتُ عَلٰى يَدَيْهِ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے سچے اور تصدیق کرنے والے رسولؐ ہیں۔ میں آپؐ کی اور آپؐ کے چچازاد بھائی یعنی جعفر بن ابی طالب کے ہاتھوں بیعت کرتا ہوں اور اُن کے ہاتھوں اپنے آپ کو اللہ ربّ العالمین کے سپرد کرتا ہوں'' (اظہار الحق، ج ۲، ص ۴۲۲)۔

● **خدا پرست علما کے کردار کی گواہی**: قرآن نے بنی اسرائیل کے خدا پرست علماء کے کردار کو نقل کرکے بھی اپنے موقف کو مدلّل کیا ہے:

کیا ان (اہل مکہ) کے لیے یہ کوئی نشانی نہیں کہ اسے علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں؟ (الشعراء ۲۶:۱۹۷)۔

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ وہ اس (قرآن) پر سچّے دل سے ایمان لے آتے ہیں (البقرہ ۲:۱۲۱)۔

جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ وہ بول اٹھتے ہیں کہ ''اے پروردگار، ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے'' (المائدہ ۵:۸۳)۔

ابن اسحاق کے مطابق جب محمدؐ کی نبوت کی خبر حبشہ پہنچی تو وہاں کے بیس عیسائیوں کا وفد مسجد حرام میں آپؐ سے آ کر ملا۔ ان کے سوالات کا جواب دینے کے بعد آپؐ نے انھیں قرآن سنایا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ آپ پر ایمان لے آئے۔ (ابن ہشام، ص ۳۳۸)

● **نافرمان قوموں کے انجامِ بد کا تذکرہ:** قرآن کے استدلال کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس نے خدا کی باغی اقوام، قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط، قومِ شعیب کے انجامِ بد کا ذکر کر کے توحید الٰہی اور نبیؐ عربی کی مخالفت کرنے والوں کو ان کے انجام بد سے ڈرایا ہے۔ سورۂ اعراف، طٰہٰ، قصص، انبیاء وغیرہ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ قرآن کے بیان کردہ تمام واقعات ایسے ہیں جن سے عرب واقف تھے اور ان کے تباہ شدہ کھنڈرات سے وہ گزرتے رہتے تھے۔

دل و دماغ میں بات اُتارنے کا وہی طرزِ استدلال سب سے زیادہ مؤثر اور فطری ہے، جو قرآن نے اختیار کیا ہے۔ قدیم علم کلام اور جدید سائنسی طرزِ استدلال کی جزوی افادیت کو تسلیم کرنے کے باوجود علما اور داعیانِ دین کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی تحریر و تقریر اور بحث و گفتگو میں قرآن کے اسلوبِ استدلال کو اپنائیں، جس میں عقلی و نقلی دلائل کا توازن ہو۔ کائنات کے ساتھ ساتھ خود نفس انسانی پر غور و فکر کی دعوت ہو۔ انبیاء اور اولیاء کے ساتھ ساتھ قدیم و جدید خدا پرست اہلِ دانش کے فکر و عمل کا حوالہ ہو اور خدا بیزار قدیم و جدید تہذیب و اقوام کی تباہی کے بیان میں عبرت و موعظت کا سامان ہو۔